حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ

عالمی مذاکرۂ ادبیاتِ اسلامی
کا
خطبۂ صدارت

۱۷ تا ۱۹ اپریل ۱۹۸۱ء ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ادبیاتِ اسلامی پر عالمی سیمینار میں پڑھا گیا۔

حضرات! آپ عربی زبان وادب کے ماہر ہیں۔ عالمِ اسلام میں اس زبان کے چوٹی کے افراد میں آپ کا شمار ہے۔ بحث وتحقیق کے میدان میں اور تالیف وتصنیف کے ضمن میں آپ کا نام بہت نمایاں ہے۔ ہم آپ کی اہمیت اور علمی مرتبت سے واقف ہیں۔ اور ہمیں مسرت ہے کہ ہم آج اس مقام پر آپ کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔ جہاں عربی زبان ایک زندہ زبان کی حیثیت سے بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اور اس قرآن مجید کی زبان میں آپ کا استقبال کر رہے ہیں، جس قرآن نے ہمیں اور آپ کو عربی زبان کی محبت بخشی، اس کو پڑھنے پڑھانے میں اپنی عمریں صرف کرنے کی توفیق دی۔ قرآن ہی وہ واحد اور یکتا کتاب ہے جس کے سمجھنے کے لئے ہم نے عربی زبان کو اپنایا اور جس کو حاصل کرنے کے لئے ہم سب نے اپنی زندگیاں صرف کی ہیں، دن رات ایک کر دئے۔ نوجوانی کی صبح سے پیری کی شام تک اس کی خدمت کو اپنا محبوب وطن مشغلہ بنایا، اس زبان کی اہمیت اور اسکی محبت نے ہمیں اپنی مادری زبانوں اور ملک، وطن کی بولیوں پر اس زبان کو فوقیت دلائی۔ ہم نے اس زبان کو آگے رکھا اور اپنی مقامی زبانوں کو پیچھے اگر قرآن کریم اس زبان میں نہ اترا ہوتا اور اگر یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان نہ ہوتی اور اگر عربی اور اسلامی علوم کا عظیم کتب خانہ نہ ہوتا جو دنیا کا عظیم ترین علمی سرمایہ ہے۔ اور جس کی تعمیر وترقی میں علماء عرب وعجم دونوں نے اپنا خون پسینہ ایک کر دیا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو ایک ایسا غیر عرب ملک اسکی جرأت نہ کرتا کہ عربی زبان وادب پر ایک بین الاقوامی سیمینار منعقد کرے اور عرب دنیا کے چوٹی کے ادباء ومفکرین اور محققین کو دعوت دے جب کہ اس سرزمین پر خود لسانی بنیاد پر جنگ وجدل قائم ہے اور مختلف تہذیبیں اور انواع واقسام کے تمدن آپس میں برسرِ پیکار ہیں اور جس سرزمین کے خمیر میں یہ زبان داخل نہیں ہے۔ اور نہ یہاں کی آب وہوا سے اس کا میل ہے۔ نہ کوئی تاریخی واقتصادی یا سیاسی تعلق ہے۔ وہاں ایسے سیمینار منعقد کرنے میں اگر قرآن کریم کا رشتہ نہ ہوتا تو یقینی جھجک محسوس ہوتی۔ دوسری تہذیب کی خوشہ چینی کے طنز کا خوف ہوتا۔ ایک فضول وقتی سمجھی جاتی،

اور اگر ایسا کرتے بھی تو بہانے تلاش کئے جاتے اور تاویلیں ڈھونڈی جاتیں۔

حضرات! ادب عربی پر یہ بین الاقوامی سیمنار ایک ایسی سرزمین پر منعقد ہو رہا ہے جہاں کبھی بھی عربی زبان ملکی زبان نہیں رہی ہے۔ دفتری و سرکاری ضرورت کے لئے کبھی استعمال نہیں ہوئی اور نہ آپس کی خط و کتابت میں اس زبان کو استعمال کیا گیا ہے۔ اگرچہ قرآن پڑھنے والے، قرآن کی زبان میں عبادت کرنے والے اور دعائیں کرنے والے اور دعائیں کرنے والے دل و جان سے اس کو عزیز رکھتے ہیں۔ لیکن ایسا کیوں نہیں ہوا کہ عربی زبان اس سرزمین کی سرکاری یا قومی زبان ہوتی، اگر ہمارے عرب مہمان معاف کریں تو میں یہ کہوں گا کہ کچھ ذمہ داری انکی بھی تھی اگر لسانی و ثقافتی بہاؤ جس نے مصر و شام و عراق کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اگر اس برصغیر کے حدود تک پہنچ جاتا اور جس طرح مشرق عربی میں اس نے اپنا مقام پیدا کر لیا اور جزیرۂ عرب سے پھوٹنے والی کرنیں اسلامی ثقافت کا اجالا جس طرح اطراف و اکناف کے ممالک میں پھیلا گئیں اسی طرح اگر ادھر بھی ان کا رُخ ہوتا تو شاید آپ کو آج کسی مترجم یا ترجمان کی ضرورت نہ ہوتی۔

اگرچہ عربی زبان اس ممالک کی قومی زبان کبھی نہیں رہی ہے۔ اور عوام کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہو رہا ہے۔ پھر بھی اس برصغیر کا تعلق عربی زبان اور عربی زبان میں تالیف و تدوین سے بہت قدیم ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ مشیت تھی کہ صدیوں سے یہ ملک کتاب و سنت کے علوم سے وابستہ رہے۔ اور اسکی وابستگی کے سبب تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رہا اور شروع ہی سے دین کی دعوت دینے والوں اور اس کی خاطر قربانی کرنے والوں کے آنے کا سلسلہ قائم رہا۔ دوسری صدی ہجری کی ابتدا میں عظیم محدث الربیع بن صبیح السعدی اس سرزمین پر آئے جن کے بارے میں کشف الظنون میں چلپی نے لکھا ہے کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے اسلام کی تاریخ میں تصنیف کا کام کیا یا جیسا کہ دوسروں نے کہا ہے اسلامی علوم کا پہلا مصنّف تھا۔ وہ عبدالملک بن شہاب المسمعی کے ساتھ نکلے تھے اور سرزمین ہند ۱۶۰ھ میں وفات پائی، انہوں نے اللہ کی راہ میں شہادت کی موت پائی اور آغاز کر گئے ایک علمی زندگی کا، بلند ہمتی اور عالی حوصلگی کی ایک داغ بیل ان سے پڑ گئی اور آنے والی نسلوں کے لئے انہوں نے اس سرزمین پر تصنیف و تالیف کے لئے ایک تخم ڈال دیا۔

کتاب و سنت جس سے ایمانی وابستگی اور عقیدہ کا تعلق ہے اور جس کی عظمت اپنی جگہ مسلم ہے۔ برّصغیر کے علماء نے صرف انہی پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ عربی زبان وادب پر بھی توجہ دی چنانچہ عربی زبان وادب سے اس سرزمین کا تعلق بہت قدیم ہے۔ وہ ہمیشہ زبان وادب کے ماہرین سے وابستہ رہے اور ان سے تعلق قائم رکھا۔ شیخ بن محمد الصغانی (متوفی ۶۵۰ھ) عربی لغت کے ان ماہرین میں ہیں جنہوں نے لغت نویسی کی بنیاد ڈالی وہ اسی برّصغیر میں پیدا ہوئے پلے اور بڑھے اور لاہور میں اپنی تعلیم مکمل کی اور اپنے وطن سے زندگی بھر

وابستہ رہے۔ ان کے متعلق سیوطی نے لکھا: سارت بتصانیفہ الرکبان وخضع لعلمہ علماء الزمان۔ یعنی ان کی تصانیف کو قافلے کر سفر کرتے۔

اور وقت کے تمام علماء نے اس کا لوہا مانا ہے۔ وہ عربی زبان کے علم بردار تھے۔ الذہبی نے لکھا ہے کہ لغت کے معاملہ میں وہ مرجع تھے۔ دمیاطی نے لکھا ہے۔ کہ وہ لغت، فقہ اور حدیث میں امام وقت تھے۔ ان کی تصانیف میں العباب الزاخر۔ لغت کی کتاب ہے جو ۲۰ جلدوں میں ہے۔ اس کے علاوہ دوسری تصانیف ہیں۔ مجمع البحرین فی اللغۃ اور النوادر فی اللغۃ والترکیب اور دوسری کتابیں بھی ہیں جس میں حیوانات کے اسماء جمع کئے ہیں اور نحو میں بھی ان کی تصانیف ہیں۔

علماء ہند کا عربی زبان وادب سے تعلق صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ اور یہ تعلق کسی ایک موضوع کا پابند اور جامد نہیں رہا ہے جیسے وہ ہمیشہ لغت ہی کی کتابیں مرتب کرتے رہے ہوتے اور فرہنگیں لکھنا ہی ان کا کام ہوتا۔ بلکہ دوسرے میدانوں میں ان کی ذہانت اور ان کے طبائع کا جوش اور ذہنی اپج نمایاں ہے۔ اور عربی زبان میں ان کی خدمات ایسی ہیں جن کی پورے عالم اسلام میں مثال نہیں مل سکتی مثلاً علامہ محمد طاہر پٹنیؒ (متوفی ۹۶۹) کی کتاب مجمع بحار الانوار چار ضخیم جلدوں میں ہے۔ جس میں حدیث نبوی کے الفاظ کی تحقیق ہے۔ علامہ سید عبدالحی حسنیؒ نے اپنی کتاب نزھۃ الخواطر میں اس کا تذکرہ اس طرح کیا ہے۔

"مؤلف نے اس کتاب میں حدیث کے تمام مشکل الفاظ جمع کر دیئے ہیں۔ اہل علم اس کے اعتراف اور اس کی قدر دانی پہ ایک زبان ہیں۔ انہوں نے یہ کارنامہ انجام دے کر اہل علم پہ بڑا احسان کیا ہے۔"

علماء اسلام کی خدمات الفاظ حدیث کی شرح میں کافی ہیں۔ جیسا کہ علم حدیث سے شغف رکھنے والے علماء کو معلوم ہے۔ لیکن حدیث پڑھانے والے اساتذہ جانتے ہیں اور جن کو فن میں رسوخ حاصل ہے۔ اور جو تدریس کے وقت عملی دشواریوں سے گذرتے ہیں کہ یہ کتاب کس درجہ کی ہے۔ اور مصنف کی نظر حدیث پہ کتنی وسیع تھی اور انہوں نے کس درجہ اس کام پہ عرق ریزی کی ہوگی۔

اہل نظر جانتے ہیں اور جن کو پڑھانے یا تصنیف و تالیف کا تجربہ ہے۔ وہ واقف ہیں کہ علمی اصطلاحات کس درجہ نازک علم ہے۔ اصطلاحات کی تشریح اور ان کے مفہوم کا تعین، بات کی تہہ اور لب لباب کو بتانا بڑا نازک ترین کام ہے۔ مصطلات کی تشریح کرنے والے کی ذمہ داری فضائی و بحری جہازوں کے راستہ بتانے والے نقشوں سے کم درجہ کی نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ذرا بھی غلطی ہو تو بحری جہاز ڈوب سکتا ہے۔ اور فضائی جہاز خاکستر ہو سکتا ہے۔ اسی طرح فن کو سمجھنے میں اصطلاح کی ذرا سی بھی غلطی پڑھنے والے کو جہل کی تاریکی میں بھٹکا کر چھوڑ سکتی ہے۔ علماء ہند کی بلند ہمتی کہئے یا ان کی خود اعتمادی کا نتیجہ یا عرب لٹریچر پہ ان کے رسوخ اور اعتماد کا مظہر کہ انہوں

نے اس نازک ترین موضوع کو اپنی تالیف کا میدان بنایا۔ اس موضوع پر علماء ہند کی وہ خدمات ہیں جنہیں بعد کے تمام مصنفین نے ...... اپنا مرجع تسلیم کیا ہے۔ شیخ عبدالغنی احمد نگری نے اپنی کتاب جامع العلوم جو "دستور العلماء" کے نام سے مشہور ہے اور چار جلدوں میں ہے۔ شیخ محمد اعلیٰ تھانوی (یہ دونوں بارہویں صدی کے علماء میں سے ہیں۔) اپنی کتاب کشاف اصطلاحات الفنون کے ذریعہ تمام علمی و ادبی دنیا سے خراج تحسین وصول کیا ہے۔ کیونکہ یہ کتاب ہزاروں صفحات کی ورق گردانی اور سینکڑوں کتابوں کے مطالعہ سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے اپنی معلومات کا نچوڑ اور اپنے علوم کا عطر نکال کر رکھ دیا ہے۔ جیسے شہد کی مکھی مختلف باغوں کے پھول پھل کو چوس کر شہد خالص تیار کر دے، علامہ سید مرتضیٰ بلگرامی جو مرتضیٰ زبیدی کے نام سے مشہور ہیں انہوں نے لغت نویسی کے فن کو نقطۂ عروج تک پہنچا دیا۔ ان کی کتاب تاج العروس فی شرح القاموس بیس ضخیم جلدوں میں واقع ہے۔ اور جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ دنیا کی کسی زندہ زبان میں ایسی لغت نہیں پائی جاتی جو اتنی باریک بینی اور اس درجہ تحقیق کے ساتھ تیار کی گئی ہو۔ یہ درحقیقت لسانی انسائیکلو پیڈیا ہے۔ مرتضیٰ زبیدی ہندوستان ہی کے ایک شہر میں پیدا ہوئے اور وہ شہر اس جگہ سے بہت زیادہ دور نہیں ہے۔ جہاں آج ہم اور آپ جمع ہیں۔ بلگرام بہت سے ادباء شعراء اور مؤرخوں کا شہر رہا ہے جن میں سرفہرست مولانا غلام علی بلگرامی کا نام آتا ہے۔ جو عربی کے نبض شناس ادیب اور قادر الکلام شاعر تھے۔ عربی میں ان کے سات دیوان ہیں۔ انہوں نے فن عروض میں اضافے کئے ہیں۔ نازک بیانی۔ تلاش۔ خیال آفرینی میں ان کا جواب نہیں۔ تاج العروس کا جہاں تک تعلق ہے، وہ علمی دنیا کی شہرۂ آفاق رکھنے والی کتاب ہے۔ اس کے نقل کرنے اور اسکی ایک کاپی حاصل کرنے میں سلاطینِ وقت اور شاہانِ عالم ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔

ادب عربی کی تاریخ میں ایک بات جو ذکر کے لائق ہے۔ اور کاروانِ ادب کے راہ رو اور اسکی منزل بمنزل پیش قدمی کا جائزہ لینے والوں کے لئے نوٹس لینا ضروری ہے۔ کہ ہندوستان فارسی ادب و ثقافت کے زیرِ اثر رہ چکا ہے۔ اور فارسی عربی زبان و ادب کے خانۂ کرم کا ایک خوشہ چیں تھا۔ اس نے اپنی مختلف زبانوں میں ایسے افراد پیدا کئے جنہوں نے ادب میں روایتی طرزِ بیان سے بلند ہو کر اپنا اسلوب متعارف کرایا، روایتی ادب ایک زمانہ میں پوری عرب دنیا پہ چھایا ہوا تھا، مقاماتِ حریری جب ادبی اسٹیج پہ سامنے آیا اور ابوزید السروجی نام کا ایک کردار بہروپیہ کی شکل میں نمایاں ہوا وہ ایک ادبی معیار بن گیا جسکی انشاء و تحریر میں تقلید کی جاتی تھی۔ اس کا اثر طبائع پر اور ادبی تحریروں میں اسی طرح رچ گیا تھا جیسے موسم کا اثر نباتات پہ یا وبا کا اثر اجسامِ انسانی پہ پڑتا ہے۔ اور جس کے اثر سے نہ کمزور محفوظ رہتا ہے نہ مضبوط، نہ بیمار نہ تندرست، عالم عرب بلکہ

عالم اسلام پر طرز حریری کا ایک بادل چھایا ہوا تھا۔ لیکن اسی زمانہ میں عربی افق بعید یعنی ہندوستان میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جیسے اندھیری رات میں جگنو ہوں انہوں نے سلامت طبع اور فکر بلند اور فطری ذوق کا ثبوت دیا — ہندوستان میں جو روایتی اسلوب سے انحراف کرتے ہوئے صحیح زبان کی خدمت اور ذوق کی پرورش کا یہ انداز ایک ادبی بدعت سے کم نہ تھا۔ کیونکہ اس دھارے کے خلاف تھا جو عالم عربی کے شرق و غرب میں بہہ رہا تھا۔ یہ بات قابل غور ہے اور اس لائق ہے کہ علمی تحقیق کا موضوع بنایا جائے۔

ان چند افراد میں جو غیر مقفع نثر میں لکھتے تھے اور ان کی تحریر آمد اور روانی ہے۔ وہ وقت کے کے خلاف، قافیہ آرائی اور تصنع سے بلند تھے۔ ان میں ہم علامہ محمد بن جون پوری کا نام لے سکتے ہیں جو اسی شہر کے ایک صوبہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۰۶۲ھ میں وفات پائی جن کی کتاب "الفوائد شرح الفوائد" ہے۔

اگرچہ ہندوستان کو اس معاملہ میں سبقت نہیں حاصل ہے کہ صنائع و بدائع کے فنون سے آراستہ عبارت آرائی اور قافیہ بندی کے بندھنوں سے آزاد ہونے والوں میں اس کا پہلا نام ہوتا اور وہ لوگ جو طبیعت کی آمد اور مزاج کے فطری بہاؤ کے مطابق لکھتے ہیں۔ ان کے درمیان اولیت اسے حاصل ہوتی، اس اولیت کا شرف تو علامہ ابن خلدون کو حاصل ہے۔ جو بلاشبہ علامۂ وقت اور فلسفۂ تاریخ کے امام تھے جن کے مقدمہ کے تاریخ نے عقل و ذوق کی قیادت کی ہے۔ اور علمی تحقیق کا اسلوب نکالا ہے۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ ہندوستان میں کوئی صاحب علم و فکر ادیب نہ پیدا ہوا ہو جس نے ابن خلدون کی طرح تصنع سے بری طرز تحریر ایجاد نہ کیا ہو۔ شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۱۷۶ھ) نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں فکر کے ساتھ اور اپنے انوکھے مضمون اور اسرار شریعت کی وضاحت ایسے اسلوب میں کی ہے جس پر روایتی ادب و انشاء کی کوئی چھاپ نہیں ہے۔ بے روح قافیہ آفرینی اور حریری کی لاحاصل تقلید کی بجائے انہوں نے اپنا عالمانہ اسلوب پیدا کیا جو زبان کی پاکیزگی اور سلامت ذوق کا اسی طرح نمائندہ ہے جس طرح فکر بلند اور علم وسیع کا، حجۃ اللہ البالغہ کا وہ باب جس کا عنوان ہے۔ المدنیۃ العجمیۃ عند بعثۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت عجمی تمدن یہ باب اپنی سادگی، سلاست، روانی اور جوش میں بے نظیر ہے۔ مقدمہ ابن خلدون کے بعد اس باب کو پڑھیئے اور زبان کی شیرینی اور علم کی فراوانی کو دیکھیئے تو اعتراف کے بغیر چارہ کار نظر نہیں آئے گا۔

شاہ صاحب کے بعد بھی سرزمین ہند میں متعدد علماء اور اہل قلم پیدا ہوئے جو سوانح نگاری اور تاریخ نویسی میں ممتاز ہوئے اور ان کی تحریریں ان کے معاصرین سے مختلف تھیں جو عرب ممالک میں تھے، ان کی تحریروں میں سادگی اور شیرینی، سلاست و قوت کا عنصر نمایاں ہے۔ ان میں خاص طور پر قابل ذکر علامہ محسن ابن یحییٰ ہیں جنکی کتاب الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبد الغنی۔ ہے اور جس کے اندر خالص عربیت کی روح جھلکتی ہے۔ اور

اندازِ بیان بہت شگفتہ ہے۔ اور ایک ماہرِ فن ادبی صلاحیت کا نمونہ ہے۔ علامہ ہند نواب سیّد صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی (متوفی ۱۳۰۷ھ) اور مورخ کبیر علامہ سید عبدالحی حسنی صاحب نزہۃ الخواطر و بہجۃ المسامع والمناظر جو آٹھ جلدوں میں ہے۔ (وفات ۱۳۴۱ھ) کے نام اس ضمن میں آتے ہیں۔

اس موقع پر مجھے اجازت دیجئے کہ ندوہ جشن ۸۵ سالہ کے موقع پر جو میں نے عرض کیا تھا اسکی چند سطر یہاں پر دہراؤں (یہ جشن ۲۵ سے ۲۸ شوال تک ۱۳۹۵ھ میں منعقد ہوا تھا۔)

علماءِ ہند کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے برصغیر ہند میں ادبی تحریک کی قیادت کی ہے۔ اور زبان و ادب کے ستون مانے گئے ہیں جن پر ادب کا قلعہ قائم ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنے اسلوب کا مالک ہے اور اپنے مقلدین کی ایک جماعت رکھتا ہے۔ اور بہت سے ان میں ایسے تھے جنہوں نے تحریر و انشاء شعر و ادب نقد و بیان میں اپنی راہ خود نکالی اور طرزِ نو کے موجد سمجھے گئے اور آج تک ان کی کتابیں اپنے اپنے موضوع پر مرجع و ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہاں علماء اور ادباء کے درمیان وہ خلیج نہیں ہے اور جہاں ادب کی ذمہ داری غیر علما کے ہاتھوں میں ہے۔ اور یہ وہ طبقہ ہے۔ جو شعر و ادب کی میراث سنبھالے ہوئے ہے۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جس کو اس سے سروکار نہیں اسکو صرف علوم شریعت سے تعلق ہے۔ اس تفریق نے دین و ادب دونوں کو نقصان پہنچایا ہے۔ ندوۃ العلماء کا یہ ادارہ جہاں آپ اس وقت جمع ہیں۔ ان سرخیل اداروں میں ہے۔ جہاں سے پہلی مرتبہ یہ آواز اٹھی کہ دین و ادب کی شاہراہیں الگ الگ نہیں ہیں اس نے دونوں گروہوں کو ایک ساتھ چلنے کی دعوت دی یعنی دعوت و تبلیغ دینی کا گروہ اور ادیبوں، انشاء اللہ پردازوں، تاریخ و تنقید کے دانشوروں کا گروہ۔ ندوہ نے ادب کی اجارہ داری کو تسلیم نہیں کیا، اور اسکی تقسیم کو ختم کرنے اور دونوں کو ایک ساتھ چلنے کی دعوت ندوہ کے ایک ذمہ دار نے جس وضاحت سے پیش کی تھی اس کا ایک نمونہ میں پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا۔

وہ ادب جس کو تقلید اور روایت سے سب سے زیادہ انکار اور لکیر کا فقیر بننے سے سب سے زیادہ عار ہونا چاہئے تھا۔ اور جس کے خمیر و سرشت میں جدت و جرأت، ذہانت، ذوق و جمال اور ادب کی زبان میں "حسن پرستی" اور جس کو بلبل کی طرح ہر گل کا شیدا اور مظہرِ جمال و کمال کا شیفتہ و فریفتہ ہونا چاہیے۔ اکثر موقعوں پر روایت، تعصب کا شکار اور رسم و رواج گرفتار نظر آتا ہے۔ ادب و انشاء کی جو تعریف استادِ اوّل نے کر دی۔ اور اس کے جو حدود و خطوط کھینچ دیئے بہت کم ادیبوں اور نقادوں کو ان سے سرتابی کرنے اور اس کے دائرہ سے باہر قدم رکھنے کی جرأت ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ ہر بعد میں آنے والا اپنے پیش رو کے قدم پر قدم رکھتا ہوا اپنا سفر طے کرتا ہے۔ اور ادبی نمونوں کے ذخیروں میں کسی اضافہ، کسی تغیر اور کسی ترمیم کی جرأت نہیں کرتا، ادب و انشاء

کی چند مثالی شخصیتیں منتخب کر لی جاتی ہیں اور ہر آنے والا اسی سبق کو دہراتا ہے ۔ اقبال کا یہ مصرعہ اس دبستان ادب پر بھی پوری طرح صادق آتا ہے ۔

کند مکتب رہ طے کردہ را طے

ندوہ نے پہلی مرتبہ عربی ادب کے خزانوں کو از سر نو کھنگالنے اور اس کا علمی جائزہ لینے کی دعوت دی کہ اس کے علمی جائزہ لینے کی دعوت دی کہ اس کے سینہ سے وہ موتی نکالے جائیں جو دین و ادب کے ایوانوں کو سجانے اور اس کی زینت کا باعث بنیں ، اور ادب کے شہ پارے ان جگہوں سے نکالے جہاں عام طور پر ادب و انشاء کی تلاش نہیں کی جاتی اور اسی کو بنیاد بنا کر اپنا نصاب تعلیم تجویز کیا جس نے دین و ادب کو شیر و شکر کر دیا اور دین کے ساتھ ادب اور ادب کے ساتھ دین دونوں میں بیک وقت رسوخ حاصل کرنے کا ذریعہ ثابت ہوا۔ اس نصاب نے عربی زبان و ادب کی قوت اور ہمہ گیری پر یقین میں اضافہ کیا اور طالب علم کے اندر چھپی ہوئی ادبی صلاحیت کو ابھارے اور ذوق کو جلا دینے کی صلاحیت پیدا کی اور یہ بتایا کہ عربی ادب میں یہ قوت ہے کہ وہ تمام بدلتے ہوئے حالات میں ضروریات کا ساتھ دے سکتا ہے ۔

یہی وہ اسباب و عوامل تھے جن کی بنا پر ندوہ نے اس علمی مذاکرہ کے منعقد کرنے کی دعوت دی اور عالم اسلام کے ان مفکرین اور ادباء کو دعوت دی جو عہد حاضر میں عربی ادب کے تسلیم شدہ ماہرین اور تربیت و تعلیم کے میدان میں جنکی رائیں علمی وزن رکھتی ہیں۔ الحمد للہ کہ انہوں نے جس فراخدلی اور مسرت سے اس دعوت کو قبول کیا اور اس مذاکرہ میں شرکت کے لئے دور دراز کا سفر کر کے اور سفر کی مشقتیں برداشت کر کے تشریف لائے وہ دعوت دینے والوں کے اخلاص اور دعوت قبول کرنے والوں کے ذوق و فکر کی دلیل ہے ۔

ہم آنے والے مہمانوں کا پر خلوص خیر مقدم کرتے ہیں اور ان اساتذہ کرام کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو اس وقت ، ہمارے درمیان تشریف رکھتے ہیں ۔ والحمد للہ اولاً و آخراً ۔

رات کی راحت
فون ۳۰۲۰
راحت فین
دن کا چین
ٹیبل سیلنگ ۔ پیڈسٹل
ایگزاسٹ
نیو کاموان انڈسٹریز ۔ سمال انڈسٹریز اسٹیٹ جی ٹی روڈ گجرات
رہائش ۳۴۷۸